ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید (پس منظر و پیش منظر)

عاصمہ اصغر *

Abstract:

Dr. Saleem Akhtar is a famous psychological critic. His domain of criticism is spread over more than 50 years. In psychological criticism, he has paved base for a new critical approach and a distinctive genere. He reaches to the subconciousness of the artist in analysis of creativity and reaches to the depth of facts through a difficult way. His criticism is a process of finding the truth in which has empowered his words. In pshychological criticism of urdu, he has proved his best abilities by identifying distinctive and new trends.

غیر تخلیقی سطح پر اردو ادب میں تنقید واحد نثری صنف ہے جو اپنی مضبوطی اور پختگی کے باعث ایک ستون کی طرح ادب کو سہارا دیے ہوئے ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو تقریباً دو صدی کے ادب میں شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما اور دیگر اصناف کی وسعت اور ہمہ گیری میں تنقید کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تذکرہ جاتی تنقید سے الگ خالص تنقید کا ایک کثیر سرمایہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ادب کی تفہیم اور تعبیر و تشریح کے جملہ مراحل میں اس نے ہر قدم پر شعر و نثر لکھنے والوں کی تحسین و تردید کا فریضہ ادا کیا ہے اور تخلیق کاروں کو کسی اصول اور ضابطے کا پابند بنانے کی سعیِ جمیلہ کی ہے۔ مولانا حالی سے آج (۲۰۱۴ء) تک تنقید نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں عہد بہ عہد سامنے آ کر سکّہ رائج الوقت بننے والے نقادوں کے متنوع اور ہمہ رنگ نظریات ادب کی جہت و سمت کے تعیّن میں اپنا حصہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ نقاد بھی شامل ہیں جنھوں نے تخلیقی سطح پر بھی اپنی پہچان قائم کی اور شاعری، افسانہ یا دیگر اصناف میں کمال کی سطح کو پہنچے۔

یوں تو ہر تخلیق کار، تنقیدی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے اور کارِ تخلیق انجام دیتے ہوئے اس کے اندر ایک تنقیدی میزان بھی قائم ہوتی ہے لیکن عملی طور پر تنقید اور تخلیق کا ایک شخصیت میں یک جا ہونا نہ صرف تخلیق بلکہ تنقید کے لیے قوت اور توانائی کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس طرح تنقید بھی ایک سطح پر تخلیقی ادب کے زمرے میں شمار ہونے لگتی ہے۔ تنقید اور تخلیق کے

* شعبہ اُردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

باہمی ربط و تعلق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اہلِ نقد نے اس میں تحقیق کو بھی شامل کر کے ایک سہ جہتی مثلث تشکیل دی ہے جس میں نقاد اگر تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ محققانہ بصیرت کا بھی حامل ہو تو اس کی بصیرت و دانائی اور تنقیدی فیصلوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور اس کی تنقیدی رائے ہر جہت سے اعتبار کی سند حاصل کرتی ہے۔

انھی نقادوں میں جو بیک وقت تخلیق کار اور محقق بھی ہیں اور تنقید میں ان دونوں صلاحیتوں کو کام میں لاتے اور ہم رکاب رکھتے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ انھیں یہ اختصاص بھی حاصل ہے کہ انھوں نے تنقید، تخلیق اور تحقیق کو باہم مربوط کر کے ہی پیش نہیں کیا بلکہ دیگر سماجی علوم، خصوصاً نفسیات کو اپنے تنقیدی عمل میں شامل کر کے اپنی تنقید کو ایک کارآمد اور مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ اسی حوالے سے وہ عام طور پر نفسیاتی نقاد کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقید میں یہ بات بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ ''انھوں نے ہر جگہ نفسیات کو اپنی ڈھال نہیں بنایا بلکہ تخلیقات کے مزاج کے مطابق جہاں نفسیات کی ضرورت محسوس کی ہے وہاں تخلیق کار اور اس کی تخلیق کو نفسیاتی حوالے سے جانچا ہے لیکن جہاں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی وہاں عمرانی اور دیگر دبستان ہائے تنقید سے استفادے کی راہیں نکالی ہیں اور اس میں انھوں نے ترقی پسندانہ نکتۂ نظر کو اختیار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک نقاد کو کسی ایک دائرے میں رہ کر کام نہیں کرنا چاہیے بلکہ مختلف سماجی علوم کا مطالعہ کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کو آزمانا چاہیے۔''(۱) چناں چہ اس بات کی وضاحت انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''میں نے ......غلو سے بچتے ہوئے ادبی تعصّبات کے لیے نفسیات کو جواز بنانے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ نفسیات بہت مفید علم ہے۔ اس سے حیات کے کئی گوشوں اور ذہن کے تاریک نہاں خانوں کو منور کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نگاہ رکھی کہ اس کی کچھ حدود بھی ہیں اور اپنے نفسیاتی جوش میں ان حدود کو پھلانگنا فائدہ کی بجائے نقصان کا موجب بن سکتا ہے۔ میں نے تنقید میں نفسیات کو صراحت کے لیے استعمال کیا ہے اس لیے تنقید کو نفسیاتی چیستان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بعض تخلیقات یا تخلیق کاروں کا نفسیات کی روشنی میں نئے انداز سے مطالعہ کیا گیا تو اس سے نئے پن کی سنسنی خیزی مقصود نہیں بلکہ صداقت کی تلاش ہے۔''(۲)

ڈاکٹر سلیم اختر نے پہلے پہل اردو تنقید کے میدان میں اپنی کتاب ''نگاہ اور نقطے'' کے ساتھ قدم رکھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب ان کی یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو سید وقار عظیم اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے نقادوں کی آرا کے ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی کا عالمانہ دیباچہ بھی اس کتاب میں موجود تھا۔ ان نقادوں نے دوٹوک الفاظ میں ان کی انفرادیت کو تسلیم کیا اور ان کے تنقیدی اسلوب کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ سید وقار عظیم نے ان کے مزاج میں جدّت پسندی کو تلاش کیا اور اس بات کو مستحسن قرار دیا کہ وہ نئی بات کو نئے انداز میں کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں (۳) ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں اردو تنقید کے نفسیاتی دبستان کا ایک نہایت زیرک اور سلجھا ہوا علم بردار قرار دیا۔ (۴) ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا کہ: ''سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید میں توازن اور بے تعصبی اختیار کر کے ہماری

تنقید کو ایک راستہ دکھایا ہے۔ اس دور میں جب کہ تنقید فقرے بازی، خود فروشی اور احباب پروری کا وسیلہ ہو رہی ہے۔"(۵)

اپنے دور کے بڑے نقادوں کی آرا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اوّل روز سے ہی تنقید کے میدان میں اپنی اہمیت تسلیم کروالی۔ انھوں نے اس عہد میں لکھی جانے والی تنقید کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اپنے لیے گریز کی راہ نکالی۔ یہاں تک کہ خالص نفسیاتی تنقید جو اس وقت ہمارا موضوع ہے، کے حوالے سے بھی ان سے پہلے جو کچھ لکھا گیا ،انھوں نے اس سے الگ زاویہ نظر اختیار کیا۔ اس بات کو ڈاکٹر وحید قریشی، جو خود بھی نفسیاتی نقادوں میں شمار ہوتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں کہ "سلیم اختر قدر و قیمت کے تعیّن میں شاعر کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نفسیات استعمال کرتے ہیں...... ادب پارے کی قدر و قیمت، ادبی مرتبے اور سماجی حالات اور فنی قدر و قیمت کے درمیان رشتے تلاش کرتے ہیں اس لیے کسی ایک نفسیاتی محرک کو بلاوجہ شاعر کی ساری زندگی پر طاری نہیں کرتے۔"(۶) عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے اکثر نقاد اور ادیب مرغ بادنما کی طرح اپنی سمت اور جہت میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے ہی اصولوں اور نظریات کے برعکس بات کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک یہ بھی انفرادیت ہے کہ انھوں نے اوّل روز سے اپنے لیے جس سمت کا تعیّن کیا وہ آج بھی مستقل مزاجی کے ساتھ اس پر کاربند ہیں۔ البتہ انھوں نے اپنے ذہن کے دریچوں کو تازہ ہواؤں کے لیے ہمیشہ کھلا رکھا ہے۔ نئے اور تازہ مطالعات کی روشنی میں انھوں نے اپنے بنیادی موقف اور نظریے سے انحراف کیے بغیر علم و آگہی کے نئے جہانوں کو دریافت کیا اور اس ارتقائی عمل کو ہمیشہ جاری رکھا جو زندگی کے لیے لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید لکھتے ہوئے آج بھی ویسے ہی تازہ دَم نظر آتے ہیں جیسے آج سے پچاس برس پہلے تھے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کی حدود پر کوئی پابندی عاید نہیں کی بلکہ بہت دلچسپی اور دل جمعی کے ساتھ مختلف علوم سے روشناسی کے مراحل طے کرتے رہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے یہ بات کہی کہ:

> "نفسیاتی تنقید کے آغاز میں مَیں نے فرائڈ سے اثرات قبول کیے مگر مزید مطالعے کے بعد جب یونگ تک پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ یونگ میں جو گہرائی ہے، اس کے اجتماعی لاشعور کے تصوّر میں جو قوت ہے وہ فرائڈ کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یونگ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ میں نے Mythology اور Aurterphology کا بھی مطالعہ کیا جن سے مجھے علامات وغیرہ کی تفہیم میں خاصی امداد ملی۔ میں اگرچہ خود مصور نہیں ہوں لیکن مجھے مصوّری سے بہت دل چسپی ہے اور میں نے اپنی محدود بساط میں مصوّری کے بارے میں جو مطالعہ کیا ہے اس کی جھلک میری تنقیدوں میں آتی ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر میرے مخصوص تنقیدی شعور کی تشکیل کی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ نفسیات کو اس میں اوّلیت حاصل ہے۔"(۷)

ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید میں اس وقت مزید وسعت پیدا ہوئی جب انھوں نے "اردو میں نفسیاتی تنقید کا دبستان" کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں انھوں نے تنقید کی مختلف اقسام اور مختلف دبستانوں کا

جائزہ نفسیات کی روشنی میں لیا ہے۔ اس تحقیقی وتنقیدی جائزے میں انھوں نے فرائڈ، یونگ اور ایڈلر سے متاثر ہونے والے پاکستانی اور ہندوستانی ناقدوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح یورپی ناقدین ہربرٹ ریڈ، کینتھ برک، ماڈیا ڈکن، لائنل ٹرلنگ وغیرہ کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے جن سے ہمارے نفسیاتی نقادوں نے استفادہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے اردو میں نفسیاتی تنقید کے ارتقا کی تمام کڑیاں تلاش کیں اور یہ ثابت کیا کہ اردو کے پہلے نفسیاتی نقاد میرا جی نہیں بلکہ مرزا ہادی رسوا تھے:

> ''اردو میں مرزا ہادی رسوا اپنے عہد آفریں ناول کی بنا پر شہرتِ دوام پا چکے ہیں۔ لیکن مرزا رسوا کی بے چین، تجربہ پسند اور جدّت کی رسیا شخصیت کے اظہار کا صرف ایک پہلو ہے۔ ورنہ مرزا رسوا نے تو کیمیا گری سے لے کر شارٹ ہینڈ کے اشارات اور اردو ٹائپ رائٹر کا'' کی بورڈ'' بنانے تک کیا کچھ نہیں کیا؟ مرزا رسوا فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے بلکہ ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر امریکہ سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی......اسی مطالعے نے انھیں وہ نفسیاتی سوچ عطا کی جس کی روشنی میں انھوں نے اردو شاعری سے وابستہ بعض مسائل کی علم النفس کی روشنی میں بہ اندازِ نو تشریح وتفہیم کی سعی کی۔ مرزا رسوا نے رسالہ ''معیار'' لکھنو کے لیے پانچ تنقیدی مضامین بطرزِ مراسلت قلم بند کیے تھے......ان تنقیدی مراسلات سے نہ صرف یہ کہ مرزا رسوا کی علمی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے بلکہ اردو تنقید میں نفسیات کے اثرات کی قدیم ترین مثال کا سراغ بھی مل جاتا ہے، اور اسی بنا پر انھیں بلاشبہ اردو کا پہلا نفسیاتی نقاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسا نقاد جس نے اپنے دور کے محدود علم النفس اور ملک میں اس کے محدود تر مطالعے کے باوجود اردو شاعری کی تنقید کی بعض اصولی بحثوں میں اسے کامیابی سے برتا۔''(۸)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تحقیق کے مطابق اردو میں نفسیاتی تنقید کا آغاز ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں پرانے ادبی جرائد میں نفسیاتی ناقدین کی تحریروں پر مشتمل اتنا مواد موجود ہے کہ اسے سمیٹنا مشکل ہے۔ اُن کا یہ انکشاف حیرت انگیز ہے کہ مغرب میں باضابطہ نفسیاتی تنقید کا زمانہ بھی یہی ہے۔ اس سے اُردو میں نفسیاتی تنقید کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے اس مقالے کو نفسیاتی تنقید کی تاریخ میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے اور اس کے بغیر اردو کے تنقیدی ادب میں نفسیات کی کارفرمائی کا کوئی بھی جائزہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس میں نہ صرف اُردو کے نفسیاتی ناقدین کی تفصیل درج ہے بلکہ اردو تنقید کے اہم ترین مباحث اور نفسیاتی تنقید کے دائرہ کار میں آنے والے موضوعات ومسائل پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو کے نفسیاتی ناقدین کے ذیل میں مرزا ہادی رسوا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، وحید الدین سلیم، میرزا محمد سعید، محمد حسین ادیب، سید شاہ محمد، میرا جی، ن م راشد، اختر اورینوی، رفیع الزمان خان، مظہر عزیز، حزب اللہ، وجیہہ الدین، شمشاد عثمانی، ڈاکٹر وحید قریشی، ریاض احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، علی عباس جلال پوری، سید شبیہ الحسن نونہروی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی، دیوندر اسّر، ڈاکٹر محمد اجمل، ابن فرید، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے نام شامل ہیں جنھوں نے فرائڈ، یونگ اور ایڈلر سے متاثر ہوکر اردو کی نفسیاتی تنقید میں اہم اضافے کیے۔ نفسیاتی تنقید کے اہم ترین مباحث میں ادیب کی شخصیت، تخلیق اور تخلیقی عمل، کلچر سے وابستہ نفسیاتی محرکات اور تخلیقات پر ان کی اثر آفرینی، تاریخی حالات،

سماجی کوائف، ادب اور اخلاق کے مسائل اور موضوع و مواد کو نفسیاتی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی طرح اسلوب کا نفسیاتی مطالعہ، علامت کی نفسیاتی اہمیت اور اس کا فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے نظریات کی روشنی میں مطالعہ، ادب اور خوابوں کی علامات کا نفسیاتی رابطہ، تشبیہ اور استعارے کی نفسیاتی اہمیت، امیج اور امیجری کا نفسیاتی جائزہ جیسے فنی مسائل پر نہایت ژرف بینی سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُردو کی بعض اہم اصناف غزل، مرثیہ، مثنوی، افسانہ، ناول، انشائیہ وغیرہ کا نفسیاتی مطالعہ کر کے ان کے مخصوص مزاج کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس مقالے کے ایک قابل ذکر حصے کو جو مغربی نفسیاتی نقادوں ارنسٹ جونز، ہانس شاس، ایڈمنڈ ولسن، لائنل ٹرلنگ، کینتھ برک، ہربرٹ ریڈ، ماڈ یا ڈکن وغیرہ کی انتقادیات پر مشتمل ہے، الگ سے ''مغربی میں نفسیاتی تنقید'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوع کا شاید پہلا کام ہے جو ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ **(۹)**

نفسیاتی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کے اس تحقیقی کام کا اجمالی تعارف پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم انھیں ایک نفسیاتی نقاد کے طور پر دیکھتے ہیں تو اس کے پس منظر میں جھانکنا بھی ضروری ہے۔ انھوں نے اردو کی نفسیاتی تنقید کی تقریباً پون صدی کی تاریخ کھنگال کر نفسیاتی ناقدین کی فرائڈ، یونگ اور ایڈلر سے اثر پذیری کا بھی سراغ لگایا اور پھر ان کے مختلف اسالیب کی نشان دہی کر کے ان کی تہ میں موجود محرکات تک پہنچے اور اس طرح ان کے بیچ میں سے ہو کر اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی۔ یہ ایک انتہائی ریاضت اور جان کاہی کا عمل ہے جس میں سراسر جی کا زیاں ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ تنقید لکھنا اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے لیے جس سطح کے مطالعے اور علم شناسی کی ضرورت ہے وہ محض دو چار کتابیں پڑھ کر میسّر نہیں آتی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ان کتابوں سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے خالص تنقیدی حوالے سے تحریر کیں۔ ''نگاہ اور نقطے'' کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں ''تنقیدی دبستان'' (۱۹۷۳ء) ''ادب اور لاشعور'' (۱۹۷۶ء) ''افسانہ، حقیقت سے علامت تک'' (۱۹۷۶ء) ایسی کتابیں ہیں، جن کی ادبی سطح پر بے پذیرائی ہوئی اور ان کے ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی نظریات واضح شکل میں ہمارے سامنے آئے۔ ''ادب اور لاشعور'' میں ادبی مسائل، ادبی اصناف اور ان سے متعلقہ مباحث پر نفسیات کے مخصوص نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار نفسیات کو اس کے وسیع ادبی تناظر میں دیکھنے کی کوشش ملتی ہے اور نفسیات کے حوالے سے تنقید، زبان و بیان اور مختلف اصناف کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کوششوں کا آغاز اگرچہ ''نگاہ اور نقطے'' ہی سے ہو گیا تھا۔ مثلاً اس کتاب میں شامل اکثر مضامین ۱۹۶۶ء کے آس پاس کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ پہلی بار کراچی کے پرچوں ''ماہِ نو'' اور ''سیپ'' میں شائع ہوئے۔ اس ابتدائی دور میں بھی ڈاکٹر سلیم اختر کا تنقیدی شعور اس حد تک بلند ہو چکا تھا۔ کہ انھوں نے غالبؔ جیسے شاعر کو ان کی شاعری اور خطوط کے آئینے میں ایک بالکل نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ صرف اس کی نرگسیت کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی بلکہ اس کے مریضانہ رشک کا رشتہ نرگسیت سے جوڑ کر اس کی نفسیاتی توجیہہ یہ بیان کی کہ غالب محبوب کو اپنی ذات کا آئینہ بناتے اور اس میں اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ چناں چہ اس حالت

میں غالبؔ کے لیے ''محبوب محض گوشت پوست کا انسان نہیں رہتا بلکہ الفتِ ذات اور اس سے وابستہ نفسی تسکین اور لاشعوری آسودگی کے لیے ایک اعلیٰ علامت کا روپ دھار لیتا ہے۔''(۱۰)

اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر نے غالبؔ کی شخصیت اور کردار کے ایک بالکل نئے رخ کا سراغ لگایا جو اس سے پہلے ناقدین کی نظر میں نہیں رہا۔ یہ رخ ''حریص لذت آزار'' ہونے کا ہے جس میں اذیت پرستی کا رجحان مطالعہ غالب کے لیے ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتا ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کے تجزیے میں انھوں نے غالب کی غزل کے مقطعوں، ردیفوں اور قافیوں پر بھی نفسیاتی حوالوں سے بحث کی ہے۔ خاص طور پر غالبؔ کی بعض مسلسل غزلوں کی ردیفوں کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح ان غزلوں کا مسلسل ہونا اس امر کا غماز ہے کہ تخلیق کے اس ارتقائی انداز سے شاعر جو لاشعوری تسکین پا رہا تھا وہ اسے ایک آدھ شعر تک محدود نہیں رہنے دیتی اور اس سے ایک ہی جذبے کی حامل مسلسل غزل لکھواتی ہے اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب لاشعور، تخلیقی شعور کا روپ دھار لیتا ہے۔(۱۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کا یہ بنیادی وصف ہے کہ وہ تنقید کے بنے بنائے راستوں پر چلنا پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے لیے خود ایک نئی راہ بناتے ہیں۔ نفسیاتی تنقید بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی لکھی ہے (جن کے نام گزشتہ سطور میں درج ہیں) لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی تنقید لکھتے ہوئے ایک اختراعی عمل تشکیل دیتے ہیں۔ اور اپنی ذہانت اور صلاحیت سے تخلیق کار اور تخلیق کے ان پہلوؤں پر غور کرتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے کسی خاص سمت کی طرف رہ نمائی کرتے اور ایک نیا منظر نامہ وجود میں لاتے ہیں۔ ان کی کتاب ''ادب اور لاشعور'' ایسی ہی مثالوں سے پُر ہے جن کی منطقی وضاحت اور صراحت ان کی تنقید کو سندِ اعتبار عطا کرتی ہے۔ اسی ضمن میں ان کی کتاب ''شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب'' (۱۹۸۴ء) کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے جس میں محض غالب کی شخصیت اور فن کے نفسیاتی زاویے ہی تلاش نہیں کیے گئے بلکہ ایک پوری تہذیب کے شعور و لاشعور اور اس کے تخلیقی ربط کو دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے داستان اور افسانے کو بھی اپنی تنقید کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ چونکہ وہ خود بھی ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں اور ''ضبط کی دیوار''، ناولٹ (۱۹۷۷ء)، ''کڑوے بادام'' (۱۹۸۸ء)، ''کاٹھ کی عورتیں'' (۱۹۸۹ء)، ''مٹھی بھر سانپ'' (۱۹۹۲ء)، ''چالیس منٹ کی عورت'' (۱۹۹۴ء)، ''آدھی رات کی مخلوق'' (۱۹۹۹ء) ''جرسِ غنچہ'' (۲۰۱۲ء) جیسے خوب صورت افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں۔ اس لیے تنقید میں ان کی زیادہ دل چسپی افسانے سے رہی ہے۔ ان کی کتاب ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، اردو افسانے کی تنقید میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر چونکہ اپنے افسانوں میں بھی تکنیک اور اسلوب پر خاص توجہ دیتے ہیں اس لیے اس کتاب میں بھی انھوں نے داستان سے لے کر جدید علامتی اور تجریدی افسانے تک مختلف افسانوی مسائل، تکنیک اور افسانہ نگاروں کا انفرادی افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جدید افسانے میں تکنیک کے مختلف تجربات پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید افسانہ نگار نے افسانے کو زمان و مکاں کے جبر سے آزاد کر دیا ہے اور خواب یا فینٹسی کی ایسی کیفیت کو پیدا کیا ہے جس کے لیے بالعموم آزاد

تلازمے یا فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی ہے اور یوں افسانے کو وقت کے تسلسل سے آزاد کر دیا ہے۔ اس طرح آج کا افسانہ نگار ماضی کے مقابلے میں سیال لاشعوری کیفیات، ذہنی واردات اور سائیکی کے داخلی خلا کے سفر کو زیادہ بہتر اور موثر انداز میں بیان کرنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ علامات، تلمیحات اور اشارات سے بھر پور کام لینے کا سلیقہ بھی جدید افسانہ نگار کے یہاں موجود ہے۔ جو افسانے کے مطالعہ کو خوش کن بناتا ہے۔ علامت اور تجرید کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا نکتہ نظر یہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے کے مترادف سمجھنا غلط ہے۔ علامت ابلاغ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ علامت ہمیں یوں سہارا دیتی ہے کہ بہت سی ناگفتنی باتیں علامت کے ذریعے گفتنی ہوتی ہیں۔ اور غور کرنے سے ہمیں ایک کہانی میں کئی کہانیاں ملتی ہیں۔ جبکہ تجرید کا اپنا ایک فلسفہ ہے جس میں لکھنے والے کو منظّم اکائیوں میں بھی زندگی نظر نہیں آتی۔ اس لیے وہ زندگی کو، جیسی وہ بے ربط اور بے ہنگم نظر آتی ہے، ویسے ہی پیش کر دیتا ہے۔ تجریدیت کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ: ''اس کا مطالعہ بھی لاشعور کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار خود کو واقعات کے فریم اور کرداروں کو افعال کا پابند نہیں بناتا، بلکہ ان سب سے آزاد ہو کر آزاد تلازمے سے خود کو دھیان کی لہروں پر آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے واقعات کو باہم پیوست کرنے والی کڑیاں ٹوٹتی جاتی ہیں جس سے افسانے میں تجریدیت پیدا ہو جاتی ہے۔'' (۱۲)

ڈاکٹر سلیم اختر نے بعض لوگوں کے اس خیال کو رد کیا ہے کہ نفسیات نے افسانے کی تکنیک یا ہیئت کو نہیں بدلا۔ بلکہ انھوں نے اس امر پر اصرار کیا ہے کہ جدید افسانے کی تکنیک یا ہیئت کے بیشتر تجربات اور انقلابی تبدیلیاں نفسیات کی مرہون منت ہیں۔ خاص طور پر افسانے نے نفسیات سے جو اہم ترین جو چیز حاصل کی ہے وہ شعور کی رَو کی تکنیک کا استعمال ہے۔ شعور کی رَو نے افسانہ نگار کو زمان و مکان کے جبر سے آزاد کر دیا ہے۔ اب افسانے میں وقت کو کسی کا بک میں بند نہیں رکھا جاتا، بلکہ افسانہ نگار وقت کو اپنے کرداروں کے جذبات اور سوچ کی عکاسی کے لیے استعمال کر کے اپنے افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر لیتا ہے۔ (۱۳)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''انشائیہ'' کو بھی اپنی تنقید میں اہمیت دی ہے۔ انشائیے کے حوالے سے انھوں نے یہ اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ فکر اور ہیئت کے اعتبار سے انشائیہ نسائی لطافت کا حامل نظر آتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ ایک بھی قابل ذکر خاتون انشائیہ نگار نظر نہیں آتی۔ انشائیہ کے نفسیاتی مطالعہ کے ضمن میں وہ یونگ کی نفسیات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انشائیہ کی صورت میں مرد اپنی نسائیت کا غیر شعوری طور پر اظہار کرتا ہے اور اپنی نسوانی روح کی پرداخت اور نشو و نما سے اپنی فطرت کی سخت کوشی کو نرم بنا کر کثافت کو لطافت میں تبدیل کرتا ہے۔ انشائیہ نگار، انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی بات کی وضاحت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی امر کی شعوری طور پر تائید یا تردید ہوتا ہے بلکہ وہ لطیف انداز اپنا کر قاری کی اسی نسوانی روح سے کلام کرتا ہے جسے عام زندگی میں شعوری طور پر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انشائیے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے یہ خیالات نہایت نازک سطح پر اس صنف کے باطن کو چُھو کر پیدا ہوئے ہیں اور یہ ان کی گہری بصیرت اور نفسیاتی غور و فکر کے آئینہ دار ہیں۔

ان سے پہلے کسی ناقد نے انشائیے کے اس رُخ کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔انھوں نے ایک اور حوالے سے انشائیے کو لوگوں کی عام سماجی زندگی سے بھی مربوط کیا ہے کہ عام زندگی میں لوگ نقلی چہرے سجائے پھرتے ہیں، مرد بننے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی نسوانی روح چھپانے کے لیے، اور انشائیہ اس نقلی چہرے کو ہٹانے کی ایک لطیف کوشش ہے۔(۱۴)

انشائیے کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کا یہ نمایاں رُخ ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر عہد میں انشائیہ کے متعلق اُٹھنے والے سوالات کے متعلق ایک واضح اور دوٹوک موقف اختیار کیا۔اس حوالے سے ان کی کتاب ''انشائیہ کی بنیاد'' (۱۹۸۶ء) خاصی اہمیت رکھتی ہے۔انھوں نے معروف نقاد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا کے اِس دعویٰ کو بہ تحقیق غلط ثابت کیا کہ وہ انشائیہ کے موجد ہیں۔اُن کا موقف ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے بہت پہلے لفظ ''انشائیہ'' استعمال ہو رہا تھا۔ یہ اصطلاح مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط کے مجموعے ''مکتوباتِ آزاد'' میں موجود ہے اور اس کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ سب سے پہلا انشائیہ بھی آزاد نے ہی لکھا۔اسی طرح ڈاکٹر اختر اور ینوی نے سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کے مجموعہ ''ترنگ'' (۱۹۴۱ء) کے دیباچے میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔اِس لیے ڈاکٹر وزیر آغا نہ تو انشائیے کے بانی ہیں اور نہ ہی اِس اصطلاح کے موجد ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر کے اِن خیالات پر خاصی لے دے ہوئی لیکن وہ اپنے مؤقف سے دست بردار نہیں ہوئے۔انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے تتبع میں لکھے جانے والے انشائیوں پر بھی یہ اعتراض کیا کہ ان میں لایعنیت میں یعنیت اور بے معنویت میں معنویت پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے اسی لیے انشائیہ عدم مقبولیت کا شکار ہے اور یہ محض وزیر آغا کے پلپلے اسلوب میں لکھی ہوئی ایک پھسپھسی تحریر بن کر رہ گئی ہے۔(۱۵)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ناول، سفر نامہ اور دیگر اصنافِ ادب کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔یہ ایک وسیع کام ہے جس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔تنقید لکھنا ایک مشکل کام ہے اور پھر نقادوں کے بارے میں ہمارے عمومی رویّے بھی اس مشکل میں اضافہ کرتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر کو اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی رہیں ان کی تفصیل تو وہ خود ہی جانتے ہیں لیکن ان کی بعض تحریروں اور انٹرویوز وغیرہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید لکھنا، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایک نفسیاتی نقاد کو تو کئی اعتبار سے اور زیادہ کٹھنائیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے کہ اس کا بنیادی کام تخلیق کار کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے اور اُن نفسی عوامل اور شخصی محرکات کا سراغ لگانا ہوتا ہے جنھوں نے ایک فرد کو خاص نوع کی شخصیت میں ڈھال کر اُسے یہ تخلیق لکھنے پر قدرت بخشی۔چناں چہ نفسیاتی نقاد کی تمام اُلجھنوں اور مشکلوں کی بنیاد یہی سوال بنتا ہے۔جس کے جواب کے حصول کے لیے اُسے نہ جانے کتنی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔خود ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں:

> ''اس سوال کے درست جواب کی تلاش میں نفسیاتی نقاد کو کئی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔اور یہی وہ سفر ہے جو معلوم (تخلیق) سے شروع ہو کر نامعلوم (لاشعور) کی منزل تک جاتا ہے۔نفسیاتی نقاد تخلیق کی صورت میں روشنی کی لکیر لے کر لاشعور کے اتھاہ اندھیرے میں جھانکنے کی سعی کرتا ہے۔نفسیاتی نقاد تمام

> تخلیقات کا سرچشمہ لاشعور کو قرار دیتا ہے۔ لاشعور تک رسائی کوئی آسان کام نہیں۔ لاشعور وہ آہوئے رَم خوردہ ہے جو نا معلوم کی وسعتوں سے کبھی کبھار جھانک لیتا ہے، جو خوابوں کی صورت میں شب خون مارتا ہے۔ کبھی کابوس کی صورت میں ڈراتا ہے تو کبھی تخلیق کی صورت میں مسکراتا ہے۔ لاشعور تو بعض اوقات تربیت یافتہ نفسی معالج کے قابو میں بھی نہیں آتا۔ نقاد تو نقاد ہی ہے۔'' (۱۶)

ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑی تفصیل سے نفسیاتی نقاد کی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ اُن کے خیال میں نفسی معالج اور نقاد دونوں لاشعور تک رسائی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں لیکن نفسیاتی نقاد کو نفسی معالج سے کہیں زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ تخلیق کار اگر اس کا ہم عصر ہے تو اس سے مکالمے کی صورت نکل سکتی ہے لیکن اگر وہ اس دنیا میں موجود نہیں تو پھر نقاد کو ہر اس ذریعے کو بروئے کار لانا پڑتا ہے جس کی مدد سے ادیب کے ذہن کے نہاں گوشوں تک رسائی ممکن ہو۔ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جس کے لیے نقاد کو کئی پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ تخلیق کار کا نفسی کوائف نامہ مرتّب کرنے کے لیے اس کے ماحول، خاندانی حالات، مزاج، عادات، اس کی زندگی میں پیش آنے والے حوادث و واقعات، اس کا کردار و عمل سب کو نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح تخلیق کار کی جنسی زندگی کے بارے میں مصدّقہ معلومات کا حصول بھی لازمی ہے۔ تب جا کر کہیں نقاد کے ذہن میں تخلیق کار کے لاشعور کی ایک تصویر بنتی ہے جسے سامنے رکھ کر وہ اس کی تخلیق کے جواز اور اس کے حُسن و قبح پر بحث کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کا جائزہ لیں تو انھوں نے اِس سارے عمل کی جزئیات تک سے خود کو گزارا ہے۔ غالبؔ کی نرگسیت کا بیان ہو یا جوش، شاد عارفی وغیرہ کا نفسیاتی تجزیہ، انھوں نے تخلیق کاروں کی نفسیاتی گرہیں اِس طور کھولی ہیں کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دیا ہے۔ اُن کے حکیمانہ اسلوب اور دانشورانہ طرزِ بیان نے نفسیاتی تنقید کو (جس پر بڑے اعتراضات ہوئے ہیں) اعتبار کے قابل بنایا۔ وہ تخلیقات، جن میں امیجز، استعارے، علامات، اساطیری روایات، طلسمات بن کر قاری کا راستہ روکتی ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی بصیرت سے اپنے پیرہن کے بند کھولتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادب کے طلسماتی جہان کو طشت از بام کرنے کا واحد ذریعہ نفسیاتی تنقید ہی ہے جس کے ذریعے لاشعور کی ہمہ جہت مگر گریز پا کیفیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کے وسیع منظر نامے کو سمجھنے کے لیے ونو با بھاوے ہزاری باغ جھارکھنڈ (بھارت) کے اسکالر ڈاکٹر جلیل اشرف کا مقالہ ''اُردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا حصّہ'' خاصی مدد دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی کی نگرانی میں مکمل ہونے والے اس مقالے پر رانچی یونیورسٹی بہار نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں پاکستان اور بھارت سے شائع ہو چکا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عاصمہ اصغر، برسبیل مکالمہ، مکالماتِ سلیم، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۲ء، ص ۸
۲۔ سلیم اختر، پیش لفظ، نگاہ اور نقطے، لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰
۳۔ وقار عظیم، سیّد، فلیپ، نگاہ اور نقطے۔
۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، فلیپ، نگاہ اور نقطے۔
۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، دیباچہ، نگاہ اور نقطے، ص ۲۲
۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، دیباچہ، نگاہ اور نقطے، ص ۱۹
۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک ملاقات، انٹرویو: ڈاکٹر طاہر تونسوی، مکالماتِ سلیم، ص ۱۹، ۲۰
۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷، ۲۸
۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۸، ۹
۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، ص ۱۷۰
۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، ص ۱۷۰
۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، ص ۲۷۱، ۲۷۲
۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، ص ۲۷۱
۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، ص ۲۷۶
۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر سے گفتگو، انٹرویو: ڈاکٹر انعام الحق جاوید، مکالماتِ سلیم، ص ۳۳
۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، ص ۲۸۲، ۲۸۳